اسلامی ریاست کی معاشی ذمہ داریاں

(از جناب محمد نجات اللہ صدیقی ایم اے لیکچرار شعبۂ معاشیات مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ)

(۲)

اس واقعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ معذور افراد کو خادم فراہم کرنا بھی اُسی اصول کے تحت آتا ہے جس اصول کے تحت بھوکے کو کھانا کھلانا۔

یہ بات کہ وہ بنیادی ضروریات کیا ہیں جن کی تکمیل کا اہتمام ضروری ہے، مقاصدِ شریعت کو سامنے رکھتے ہوئے مذکورہ بالا آثار و احادیث کی روشنی میں طے کی جائے گی۔ غذا، لباس اور سر چھپانے کے لیے مکان ایسی ضروریات ہیں جن کی تکمیل نہ ہو تو آدمی کی جان چلی جانے کا اندیشہ ہے۔ یہی حیثیت مریض کے لیے علاج کی ہے۔ چونکہ قیامِ حیات، شریعت کے اولین مقاصد میں سے ہے لہٰذا ان چاروں ضروریات کی تکمیل کو لازماً کفالتِ عامّہ کے اصول میں شامل سمجھنا چاہیے۔

ان اہم ترین ضروریات کے علاوہ بعض اور ضروریات ہیں جن کو اس فہرست میں شامل کرنے پر غور کیا جا سکتا ہے۔ مذکورۂ بالا آثار میں معذور افراد کے لیے خادم فراہم کرنے کا ذکر آیا ہے۔ یہ ضرورت ایسی ہے کہ اگر معذور فرد اپنے اہلِ خاندان کے تعاون سے یا خود اپنے مال کے ذریعہ خادم رکھ کر گزارا نہ کر سکتا ہو تو معاشرہ کو اس کی یہ ضرورت پوری کرنی چاہیے۔ اگر اسے نہ پورا کیا گیا تو اس کے لیے زندگی گزارنا ممکن نہیں رہے گا۔ ہاتھ پاؤں سے معذور افراد، اندھے، مُزمن امراض میں مبتلا افراد کے لیے ایسے ادارے قائم ہونے چاہییں جہاں اُن کی خدمت اور دیکھ بھال کا اجتماعی طور پر انتظام ہو۔ ایسے ادارے معاشرہ میں افراد کے رضاکارانہ تعاون سے بھی قائم ہو سکتے ہیں اور ریاست کے زیرِ اہتمام بھی چلائے جا سکتے ہیں۔ بالآخر یہ ذمہ داری اسلامی ریاست کی ہوگی کہ ہر معذور فرد کو کوئی مناسب سہارا مل جائے۔

اس ضرورت کو علیحدہ سے شمار کرنے کی بجائے اسے علاج کے وسیع مفہوم میں شامل سمجھا جا سکتا ہے۔

ایک اور اہم ضرورت "تعلیم" کی ضرورت ہے۔ ہر مسلمان کے لیے اسلامی تعلیمات کا علم حاصل کرنا فرضِ عین ہے، اور اسلامی ریاست کے اہم ترین فرائض میں مسلمانوں کو اسلامی طرزِ زندگی کی تعلیم دینا شامل ہے۔ یہاں اس فرض سے بحث نہیں بلکہ اس بات پر زور دینا مقصود ہے کہ دورِ جدید میں ریاست اس فرض کو ادا کرنے میں اُسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب، وہ اپنے شہریوں کی عام تعلیم یعنی پڑھنا اور لکھنا سکھانے کا اہتمام کرے۔ اس کا اہتمام قرنِ اوّل کی اسلامی ریاست بھی کرتی تھی، جیسا کہ اوپر نقل کیے ہوئے آثار سے واضح ہوتا ہے۔

عام تعلیم ایک شعوری دینی زندگی اور کامیاب دنیوی زندگی کے لیے ضروری ہے۔ پھر یہ دین کا علم حاصل کرنے کا ناگزیر ذریعہ بھی بن چکی ہے۔ اس کے ماسوا ہر جمہوری سماج کی طرح اسلام کے شورائی نظامِ حکومت کی صحت اور استحکام کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ عام شہری تعلیم یافتہ ہوں۔ عام شہری کو حکومت پر صحت مند تنقید کرنے، ملک کے مختلف مسائل میں اپنی رائے قائم کرنے اور مشاورت میں حصہ لینے کے لیے بغیر تعلیم کے نہیں تیار کیا جا سکتا۔ ان دلائل اور مصالح کے پیشِ نظر دورِ جدید کی ایک اسلامی ریاست کو اپنے شہریوں کی تعلیم کو بھی ان کی بنیادی ضروریات میں شامل سمجھنا چاہیے۔

مذکورہ بالا آثار میں دو اور ضرورتوں کا ذکر آیا ہے۔ مقروض افراد کے قرضوں کی ادائیگی اور شادی کے قابل غریب افراد کو شادی کرنے کے لیے مالی امداد۔

مقروض افراد کو ادائے قرض کے لیے مالی امداد دینے کے بارے میں کوئی عام اصول وضع کرنا مشکل ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے جس بات کا ثبوت ملتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ اگر ریاست کے خزانہ میں، دوسری ضروریات کی تکمیل کے بعد گنجائش ہو تو وہ ان مرنے والوں کے قرضے ادا کرنے کی ذمہ داری لے لے جنہوں نے اتنا ترکہ نہ چھوڑا ہو جو ادائے قرض کے لیے کافی ہو۔ اس کے علاوہ قرض کے بارے پریشان افراد کو زکوٰۃ کے مال میں سے ادائے قرض کے لیے مالی امداد دی جانی چاہیے۔ ان مخصوص حالات کے علاوہ ریاست پر بار نہیں ڈالا جا سکتا کہ وہ ہر

مقروض فرد کا قرض ادا کرے کیونکہ اس سے گوناگوں مفاسد پیدا ہو سکتے ہیں، ماسوا اس بار کے جو ریاست کے خزانہ پر پڑے گا۔

غذا، لباس، مکان، علاج اور تعلیم کی جن بنیادی ضروریات کی تکمیل کو ہم نے بالآخر اسلامی ریاست کی ذمہ داری قرار دیا ہے ان کے سلسلہ میں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ ان کی وہ کم سے کم مقداریں کیا ہیں جن کی فراہمی اس ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے ضروری سمجھی جائے گی۔ اس سوال کا اصولی جواب یہ ہے کہ غذا، لباس اور مکان کی ضرورتیں کم سے کم اس حد تک پوری کی جانی چاہییں کہ بھوک، پیاس، سردی یا گرمی کی شدت اور بارش وغیرہ کے نتیجہ میں فرد کی جان جانے کا اندیشہ نہ باقی رہے اور اس کے اندر اتنی طاقت بحال رہے کہ وہ کسب معاش کی جدوجہد کر سکے۔ اس اصولی بات سے آگے بڑھ کر اشیاء مطلوبہ کی کیفیت یا کمیت کے بارے میں کوئی صراحت کرنا دشوار ہے ان کی تعیین احوال و ظروف پر مبنی ہوگی۔ جہاں تک مریض کے علاج کا تعلق ہے ایسا انتظام کیا جانا چاہیے کہ محروم افراد ملک کی عام معاشی سطح کے مطابق ضروری طبی خدمات اور دوائیں مفت حاصل کر سکیں۔ تعلیم کم از کم اتنی ہونی چاہیے کہ ہر فرد پڑھنا اور لکھنا سیکھ لے۔ قرآن کا ناظرہ پڑھنا، اسلام کی بنیادی تعلیمات سے واقفیت، جاہلیت اور اسلام کے درمیان تمیز کی صلاحیت اور عبادات کے طریقے اور عام معاملات زندگی میں اسلامی حدود سے آگاہی ابتدائی اسلامی تعلیم کے لازمی معیار میں شامل ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کم سے کم سطح سے آگے بڑھ کر دینی اور دنیوی علوم و فنون کی اچھی سے اچھی تعلیم دینا ہر ریاست کا مطمح نظر ہونا چاہیے۔ لیکن ہم یہاں صرف کم سے کم اور لازمی معیار پر گفتگو کر رہے ہیں۔

یہ سوال بھی اٹھایا جا سکتا ہے کہ ریاست یہ انتظامات عملاً کس طرح کرے گی۔ اس بات کی کیا ضمانت ہوگی کہ افراد انتظامات سے بے جا اور بغیر استحقاق فائدہ نہیں اٹھائیں گے یا کاہلی اور بے عملی کے ذریعہ خود کو محروم بنانے کی کوشش نہیں کریں گے۔ لیکن جدید متمدن ممالک اور موجودہ فلاحی ریاستوں (WELFARE STATES) کے تجربوں کی روشنی میں ان مسائل کا حل بآسانی ممکن ہے۔ ان

انتظامات سے بے جا فائدہ اٹھانے کا سدِ باب اخلاقی تربیت، رائے عامہ کے دباؤ اور تعزیری سزاؤں کے ذریعہ کیا جاسکتا ہے۔ قابلِ کار محروم افراد کو ان ضروریات کی تکمیل کے پہلو بہ پہلو کام کرنے پر بھی مجبور کیا جاسکتا ہے۔

۳۔ معاشرتی ترقی کا اہتمام | کفالت عامہ کی طرح ملک کی معاشی تعمیر و ترقی بھی ایک اجتماعی فریضہ ہے۔ اگر کفالتِ عامہ سے ہر فرد کی ضروریات کی تکمیل اور قیامِ حیات وابستہ ہے تو معاشی تعمیر و ترقی سے پورے اجتماع کا قیام و بقاء اس کی قوت کا استحکام اور اس کی جملہ دنیوی مصالح وابستہ ہیں جن کا تحفظ ریاست کو وجود میں لانے کا ایک اہم سبب ہے۔ یہ ذمہ داری اگرچہ افراد پر ان کی انفرادی حیثیتوں میں بھی عائد ہوتی ہے لیکن اجتماع کے نمائندہ صاحبِ اقتدار ادارہ ریاست پر اس کی ذمہ داری بہت زیادہ ہے۔

کسی ملک کی معاشی تعمیر و ترقی اس ملک کی فوجی طاقت اور دفاعی قوت کی بنیاد اور اس کے سیاسی استحکام کی لازمی شرط ہے۔ آج کل دفاعی قوت براہِ راست صنعتی ترقی سے وابستہ ہے۔ محفوظ دفاعی پالیسی کا ایک مسلمہ اصول یہ ہے کہ ملک اہم دفاعی سامانوں کے لیے دوسرے ممالک بالخصوص کسی دوسرے تہذیبی بلاک سے تعلق رکھنے والے ممالک کا محتاج نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ جدید آلاتِ حرب اور دفاعی سامان کسی ملک میں اسی وقت تیار کیے جاسکتے ہیں جب وہ صنعتی ترقی کے ایک اونچے معیار تک پہنچ چکا ہو۔ یہ بات محتاجِ دلیل نہیں کہ قرآن و سنت میں دارالاسلام کی فوجی طاقت اور دفاعی قوت کے استحکام پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ (انفال-۶۱) اور اُن کے لیے جتنی قوت تم سے ممکن ہو سکے فراہم کر رکھو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے زمانہ کی مختلف فوجی تیاریوں، تیر اندازی اور گھوڑ سواری کی مشق اور اسلحہ اور گھوڑے فراہم کر رکھنے پر صحابۂ کرام کو برابر ابھارتے رہتے تھے۔ آج کی فوجی تیاریاں اور قوت کے ذرائع مختلف ہیں۔ آج اسی حکم اور انہی ارشاداتِ نبوی کا منشاء یہ ہے کہ زمانہ کے

معیار کے مطابق فوجی قوت پیدا کی جائے اور تیاریاں کی جائیں۔ چونکہ یہ مقصد صنعتی ترقی اور فولاد، ایٹمی توانائی، اور بجلی کی طاقت جیسی بنیادی صنعتوں کے فروغ کے بغیر نہیں حاصل کیا جا سکتا اس لیے ان چیزوں کا اہتمام بھی لازم قرار پائے گا۔ کسی شرعی فریضہ کی ادائیگی اگر کسی مباح کام پر موقوف ہو تو وہ کام بھی فرض ہو جاتا ہے۔

معاشی تعمیر و ترقی کا اہتمام فقر و فاقہ کے انسداد اور کفالتِ عامہ کی ذمہ داری ادا کرنے کے لیے بھی ضروری ہے۔ قومی پیداوار میں اضافہ کی مؤثر تدابیر نہ اختیار کی جائیں تو صرف موجودہ دولت کی از سرِ نو تقسیم کے ذریعہ کسی ملک کے ہر فرد کو ایک معقول معیارِ زندگی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ اس نکتہ پر غور کرتے وقت یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہے کہ آج مسلمان ممالک جن میں اسلامی ریاست کے قیام کا امکان ہے، معاشی طور پر پس ماندہ اور کم ترقی یافتہ ہیں۔ ان کی قومی پیداوار کی موجودہ سطح ان کی بڑھتی ہوئی آبادیوں کے لیے ناکافی ہے۔ اور وہ صرف یہ طریقہ اختیار کر کے کفالتِ عامہ کی ذمہ داری نہیں ادا کر سکتے کہ امیر لوگوں سے ان کی دولت کا ایک حصہ لیکر اہلِ حاجت کے درمیان تقسیم کر دیں۔

دورِ جدید کی ایک اسلامی ریاست اپنی تہذیبی انفرادیت کو بھی اسی وقت برقرار رکھ سکتی ہے جب وہ صنعتی طور پر غیر مسلم دنیا سے بڑی حد تک بے نیاز ہو جائے اور کم از کم ضروری سامانِ زندگی کے لیے ان ممالک کی محتاج نہ ہو۔ جو ممالک صنعتی طور پر دوسرے ملکوں پر بہت زیادہ انحصار کرتے ہیں وہ تہذیبی طور پر بھی ان کا اثر قبول کرنے لگتے ہیں۔ اس حقیقت سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ آج اسلامی ممالک کی صنعتی پس ماندگی اور مغرب کی محتاجی ان پر مغربی تہذیب کے اثر اور مغربی غلبہ و استیلا کا ایک اہم سبب ہے۔ ایک اسلامی ریاست کے سامنے صرف یہی مقصد نہ ہو گا کہ وہ تہذیبی طور پر ممتاز اور اجنبی تہذیبوں کے اثرات سے محفوظ رہے۔ بلکہ اُسے تہذیب اور نظریات کے میدان میں ایک فعّال، داعیانہ کردار اختیار کرنا ہے۔ داعی کی حیثیت دینے والے کی ہونی چاہیے نہ کہ دستِ سوال دراز کرنے والے کی۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب دارالاسلام صنعتی ترقی کے میدان میں اگر دوسرے

ملکوں سے آگے نہیں تو اُن سے بہت پیچھے بھی نہ ہو۔

قرنِ اوّل کی اسلامی ریاست نے موقع پڑنے پر غیر مسلم دنیا کی تالیفِ قلب کے لیے اس کو مالی اور مادّی امداد بھی دی ہے کیونکہ تالیفِ قلب اسلام کے داعیانہ پروگرام کا ایک مستقل جزو ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے مکّہ میں قحط کے زمانہ میں پانچ سو اشرفی نقد اور ضروری اجناس بھیج کر مدد کی تھی۔[۱] آج جبکہ تہذیبی کشمکش اور نظریاتی جنگ میں بیرونی امداد اور بین الاقوامی معاشی تعاون کو ایک اہم مقام حاصل ہو چکا ہے۔ ایک اسلامی ریاست کے پاس اتنے وسائل ہونے چاہییں کہ وہ اپنی دعوت کے لیے راہ ہموار کرنے کی خاطر ان ذرائع کو استعمال کر سکے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب دارالاسلام معاشی طور پر ترقی یافتہ ہو۔

ان دلائل کی روشنی میں ہم اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ ایک اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے ملک کی معاشی تعمیر و ترقی کا اہتمام کرے۔ اوپر ہم لکھ چکے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے صاحبِ امر کو مسلمانوں کے ساتھ ہر ممکن خیر خواہی کرنے کا حکم دیا ہے۔ ظاہر ہے اس خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ ریاست ملک کی معاشی تعمیر و ترقی کے لیے مناسب اقدامات کرے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم سے ماثور ایک حدیث قدسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ملک کی خوش حالی کا اہتمام اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔ امام سرخسی لکھتے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک اثر منقول ہے جس میں وہ اپنے پروردگار عزّ وجل کا یہ فرمان نقل کرتے ہیں کہ:

عمّروا بلادی فعاش فیھا	انہوں نے میرے ملکوں کو آباد کیا جن میں میرے
عبادی[۲]	بندے زندگی بسر کرتے رہے۔

اسی بنا پر اسلامی مفکرین نے ملک کی خوش حالی کے اہتمام کو اسلامی ریاست کے صدر کی ذمہ داری قرار دیا ہے۔ ماوردی نے امام کے فرائض گناتے ہوئے لکھا ہے:

والذی یلزم سلطان الامۃ سبعۃ	اُمت کے حکمران پر سات ذمہ داریاں عائد

[۱] سرخسی: المبسوط جلد ۱۰ صفحہ ۹۱-۹۲ [۲] سرخسی: المبسوط جلد ۲۳ صفحہ ۱۵

اشیاء . . . . . ہوتی ہیں . . . . . .

والثالث عمارة البلدان باعتماد مصالحها وتهذيب سبلها ومسالكها[1]

ان میں سے تیسری ذمہ داری یہ ہے کہ (اپنے زیر حکومت) ممالک کے جملہ مصالح کے تحفظ اور اس کی شاہراہوں اور دوسرے ذرائع نقل و حمل کو بہتر بنا کر ان ممالک کو آباد و خوش حال رکھے۔

ماوردی نے ایک حدیث بھی نقل کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں ملک کو آباد و خوش حال رکھنے کے کام کی قدر و قیمت کیا تھی۔

قال ابو هريرة سبت العجم بين يدى رسول الله صلى الله عليه وسلم فنهى عن ذالك وقال لا تسبوها فانها عمرت بلاد الله تعالى فعاش فيها عباد الله تعالى[2]

ابوہریرہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اہل عجم کو برا کہا گیا تو آپ نے ایسا کرنے سے منع کیا اور فرمایا: ان کو برا نہ کہو کیونکہ ان لوگوں نے اللہ کے ملکوں کو آباد اور خوش حال بنایا تو ان میں اللہ تعالیٰ کے بندوں نے زندگی گزار دی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی ملک کو خوش حال رکھنے اور ترقی دینے کا اہتمام کرتے تھے۔ آپ نے والی مصر حضرت عمرو بن العاص کو خط لکھا تھا کہ مقوقس سے دریافت کریں کہ مصر کی خوش حالی اور بربادی کا انحصار کن عوامل پر ہے۔ آپ نے انھیں تاکید کی تھی کہ ایسی تدابیر اختیار کریں جن سے خوش حالی میں اضافہ ہو[3] حضرت عمرو بن العاص نے حضرت عمرؓ کے سامنے یہ تجویز بھی رکھی کہ اگر بحیرۂ روم اور بحیرۂ قلزم کو ایک نہر کے ذریعہ ملا دیا جائے تو مدینہ میں بحیرۂ روم کے اردگرد کے زرخیز علاقوں سے غلہ کی درآمد آسان ہو جائیگی اور وہاں غلہ کا نرخ ارزاں رہا کرے گا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو لکھا کہ اس تجویز پر فوراً عمل کیا جائے۔ چنانچہ یہ نہر کھودی گئی اور

---

[1] ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب البصری الماوردی : ادب الدین والدنیا مطبعۃ دار الکتب العربیۃ الکبریٰ مصر طبع اول صفحہ ۸۲ [2] ایضاً صفحہ ۸۱

[3] ابن عبدالحکم بحوالہ کنز العمال جلد ۳ نمبر ۲۴۰۰

جب تک یہ نہر قائم رہی مدینہ کو دوبارہ غذائی قلت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ اس سے خود مصر کی خوش حالی میں بھی اضافہ ہوا[1]

آپ ہی کے حکم سے بصرہ کے والی حضرت ابوموسیٰ اشعری نے ایک نہر کھدوائی تھی جو نہر ابلہ کے نام سے مشہور ہوئی[2]۔ اسی طرح انبار کے زمینداروں کی فرمائش پر حضرت سعد بن ابی وقاص کے حکم سے ایک نہر کی تعمیر شروع ہوئی جسے بعد میں حجاج بن یوسف نے مکمل کرایا[3]۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بصرہ میں نہر ابن عمر کھدوائی[4]۔ نہروں کی تعمیر کا جو سلسلہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور سے شروع ہوا وہ بعد میں بھی جاری رہا[5]۔ اگر یہ حقیقت سامنے رہے کہ قرن اوّل اور اس کے بعد ان ادوار میں اسلامی ممالک کی معیشت ایک زرعی معیشت تھی تو نہروں کی تعمیر کی معاشی اہمیت کا پوری طرح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

نہروں کی تعمیر کے علاوہ حسب ضرورت سیلاب کی روک تھام کے لیے بند بھی تعمیر کروائے گئے چنانچہ حضرت عمرؓ نے مکہ میں اس مقصد کے لیے ایک بند تعمیر کروایا[6]۔

اپنی رعایا کے لیے وسائل زندگی میں فراوانی چاہنا حضرت عمر کی مالی پالیسی کا ایک اہم اصول تھا۔ اس کا اعلان آپ نے اپنے پہلے ہی خطبہ میں ان الفاظ میں فرمادیا تھا۔

ولیس اجعل امانتی الی احدٍ	میں اپنی امانت (یعنی حکومت کے عہدے) ایسے افراد
لیس لها باهلٍ ولکن اجعلها الی من	کے سپرد نہیں کروں گا جو اس کے اہل نہ ہوں بلکہ ایسے
تکون رغبته فی التوفیر للمسلمین	افراد کے سپرد کروں گا جو مسلمانوں کے لیے فراوانی ہم
اولئك احق بهم من سواهم[7]۔	پہنچانا چاہتے ہوں۔ دوسروں کی بہ نسبت ایسے
	افراد مسلمانوں (کی حکمرانی) کے زیادہ حق دار ہیں۔

---

[1] طبری: تاریخ بحوالہ بالا صفحہ ۲۵۷۷ (حوادث ۱۸ھ) [2] بلاذری: فتوح البلدان طبع قاہرہ صفحہ ۳۵۱ [3] ایضاً صفحہ ۲۷۳ [4] ایضاً صفحہ ۳۶۴۔
[5] ایضاً صفحہ ۲۵۳ تا ۳۶۵ اور صفحہ ۲۷۳ و ۲۷۴ [6] ایضاً صفحہ ۶۵
[7] موطا امام مالک۔

آپ مسلمانوں کی خیرخواہی کا تقاضا سمجھتے تھے کہ انہیں زیادہ سے زیادہ مال دیا جائے اور انہیں مشورہ دیتے تھے کہ فوری ضروریات سے جو مال فاضل ہو اسے نفع آور کاروبار میں لگائیں "تاکہ وہ آئندہ مستقل آمدنی کا ذریعہ بنے۔

قدم خالد بن عرفطة العذری علی عمر فسألہ عمر عما وراءہ فقال ترکتهم يسألون الله لك ان يزيد في عمرك من اعمارهم ما وطیٔ احد القادسية الا وعطاءه الفان او خمس عشرة مائة وما من مولود ذكرا كان او انثى الا الحق في مائة وجريبين في كل شهر۔

خالد بن عرفطہ عذری عمرؓ کے پاس آئے تو عمرؓ نے اُن سے دریافت کیا کہ جہاں سے آرہے ہو وہاں لوگوں کا کیا حال ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں انہیں اس حال میں چھوڑ کر آیا ہوں کہ وہ اللہ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ ان کی عمروں میں سے کچھ مدت کم کر کے آپ کی عمر میں اضافہ کر دے۔ جس نے بھی قادسیہ میں قدم رکھا تھا اس کا وظیفہ دو ہزار یا پندرہ سو درہم سالانہ ہے ہر بچہ کے لیے خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی، پیدا ہوتے ہی سو (درہم) اور دو جریب (غلہ) ماہانہ مقرر ہو جاتا ہے۔

قال عمر: انما هو حقهم۔ وانا اسعد باداۂ اليهم۔ لو كان من مال الخطاب ما اعطيتموه۔ ولكن قد علمت ان فيه فضلا۔ فلو انه اذا خرج عطاء احد هؤلاء ابتاع منه غنما فجعلها بسوادهم فاذا خرج عطاءه ثانية ابتاع الراس والراسين فجعله فيها فان بقي احد من ولده كان لهم

عمر نے کہا: یہ اُن کا حق ہے، میں اسے انہیں دے کر اپنا بھلا کر رہا ہوں۔ اگر یہ خطاب کا مال ہوتا تو تمہیں نہ دیا جاتا۔ البتہ میں یہ جانتا ہوں یہ مال ضرورت سے زیادہ ہوتا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر لوگ ایسا کرتے کہ جب کسی کو وظیفہ ملے تو اس میں سے کچھ بھیڑ بکریاں خرید کر اپنے زرخیز زرعی) علاقہ میں چھوڑ دے پھر جب دوسرے سال کا وظیفہ ملے تو ایک یا دو غلام خرید کر ان کو بھی اسی (علاقہ میں کام پر) لگا دے اگر ان کی اولاد میں سے کوئی باقی رہا تو اس طرح اس کے لیے ایک قابلِ اعتماد سہارا فراہم ہو جائیگا کیونکہ مجھے معلوم نہیں کہ میرے بعد کیا ہوگا۔

شئی قد اعتقدوہ فانی لاادری ما یکون بعدی وانی لاعمّ بنصیحتی من طوقنی اللہ امرہٗ فان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من مات غاشًا لرعیتہ لم یجد رائحۃ الجنۃ [1]

میں تو ہر اس فرد کے ساتھ پوری خیر خواہی کرتا ہوں جس کے امور کا اللہ نے مجھے نگران بنایا ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو اپنی رعیت کے ساتھ بدخواہی اور خیانت کرتا ہوا مرے گا وہ جنت کی خوشبو بھی نہ پا سکے گا۔

دوسرے خلیفۂ راشد کے اس اثر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اصحاب امر کو عامۃ المسلمین کے ساتھ جس خیر خواہی کی تائید کی ہے اس کا تصور کتنا وسیع ہے اگر صاحب امر رعایا کی مادی فلاح و بہبود کے اہتمام میں کوئی کسر اٹھا رکھے تو حضرت عمر کے نزدیک یہ بھی بدخواہی (غش) ہوگی اور ایسا کرنے والا آخرت میں جنت سے محرومی کا خطرہ مول لے گا۔

خلفاء کو اس بات کی بڑی فکر رہتی تھی کہ اشیاء ضرورت کے نرخ ارزاں ہیں چنانچہ وہ مختلف علاقوں کے نرخ معلوم کرتے رہتے تھے اور اگر انھیں یہ خبر ملتی کہ نرخ ارزاں ہیں تو اطمینان کا اظہار کرتے تھے سلمہ بن قیس اشجعی کا قاصد عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے دریافت کیا کہ اشیاء کے نرخ کیسے ہیں۔ قاصد نے جواب دیا کہ بہت ارزاں ہیں۔ آپ نے دریافت کیا کہ گوشت کا کیا نرخ ہے کیونکہ یہی عربوں کا اصل سہارا ہے۔ تو قاصد نے آپ کو گائے اور بکری کے گوشت کے نرخ الگ الگ بتائے [2]

یہی طریقہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا رہا۔

عن موسیٰ بن طلحۃ قال: سمعت عثمان بن عفان وھو علی المنبر والموذن یقیم الصلوٰۃ وھو یستخبر الناس یسأل عن اخبارھم واسعارھم [3]

موسیٰ بن طلحہ سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا ہے: "میں نے عثمان بن عفان کو منبر پر بیٹھ کر، جب کہ مؤذن نماز کے لیے اقامت کہہ رہا تھا، لوگوں سے ان کے حالات خبریں اور اشیاء کے نرخ دریافت کرتے سنا ہے۔"

---

[1] بلاذری فتوح البلدان صفحہ ۴۳۹ [2] طبری تاریخ صفحہ ۲۷۱۹ حوادث ۲۲ھ

[3] مسند احمد۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز اپنے والیوں کو تاکید کرتے تھے کہ بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنانے کی تدابیر اختیار کریں[1]۔ آپ نے عراق کے والی کو یہ بھی لکھا تھا کہ بیت المال کے فاضل مال میں سے کاشتکاروں کو زرعی اغراض کے لیے قرض دیئے جائیں[2]۔

امام ابو یوسف نے خلیفہ ہارون الرشید کو مشورہ دیا تھا کہ:

"میری رائے میں آپ خراج کے افسران کو ہدایت کر دیں کہ جب ان کی عملداری کے کچھ لوگ اُن کے پاس آکر یہ بتائیں کہ ان کے علاقہ میں بہت سی قدیمی نہریں ہیں جو اب ناکارہ ہو گئی ہیں اور بہت سی زمینیں زیر آب آگئی ہیں، اور اگر ان نہروں کو درست کرا دیا جائے اور ان کی کھدائی کر کے اُن میں پانی جاری کر دیا جائے تو یہ ناکارہ زمینیں آباد کر لی جائیں گی اور اس طرح خراج کی آمدنی میں بھی اضافہ ہو جائے گا تو اس کی اطلاع آپ کو لکھ بھیجی جائے۔ پھر آپ کسی معتمد علیہ، امانت دار، صاحبِ صلاح و تقویٰ آدمی کو اس بارہ میں جائزہ لینے کے لیے بھیجیں۔ یہ آدمی اس علاقہ کے ثقہ، واقف کار اور صاحبِ بصیرت لوگوں سے معلومات حاصل کرے اور اس علاقہ کے باہر کے تجربہ کار اور صاحب رائے افراد سے بھی مشورہ کرے یہ افراد ایسے ہوں جو خود اس کام کے ذریعہ کوئی نفع حاصل کرنے یا اپنے کسی نقصان کی تلافی کے متمنی نہ ہوں۔ اگر سب کی رائے یہی ہو کہ اس اسکیم کو زیرِ عمل لانے میں ملک کا فائدہ ہے اور خراج کی آمدنی میں اضافہ کی توقع ہے تو آپ ان نہروں کی کھدائی کا حکم دے دیجیے اور اس کے سارے مصارف کا بار بیت المال پر ڈالیے۔ ان اخراجات کا بار اس علاقہ کے باشندوں پر نہ ڈالیے۔ ان لوگوں کا آباد و خوش حال رہنا ان کے اُجڑ جانے اور مفلس ہو کر ادائے خراج سے عاجز رہنے سے بہتر ہے۔ اپنی زمینوں اور نہروں کے سلسلہ میں اہلِ خراج کے ہر اس مطالبہ کو پورا کرنا چاہیے جس سے ان کے مفادات و مصالح کی ترویج ہوتی نظر آئے بشرطیکہ اس اسکیم پر عمل کرنے سے گرد و پیش کے دوسرے گاؤں اور قصبات کو نقصان پہنچے

---

[1] ابو یوسف: کتاب الخراج ص ۱۰۲ [2] ابو عبید کتاب الاموال ص ۲۵۱

کا اندیشہ نہ ہو۔ اگر ان کی تجویز پر عمل سے دوسروں کی پیداوار کم ہو جانے اور خراج کی آمدنی میں کمی ہونے کا اندیشہ ہو تو اس کو نہیں منظور کرنا چاہیے۔

باشندگانِ سواد کو اگر اپنی اُن بڑی نہروں کی کھدائی اور صفائی کی ضرورت پیش آئے جو دجلہ اور فرات سے نکالی گئی ہیں تو آپ ان کی کھدائی اور صفائی کروا دیا کیجیے، اور اس کے مصارف کا بار بیت المال اور اہلِ خراج دونوں پر ڈالیے لیکن سارا بار اہلِ خراج ہی پر ڈال دینا صحیح نہ ہوگا . . . . . دجلہ اور فرات اور دوسرے بڑے دریاؤں پر گھاٹ یا پانی کے نکاس کی جگہوں کی تعمیر اور مرمت پر آنے والے مصارف کا پورا بار بیت المال پر ڈالا جائے۔ اہلِ خراج پر اس سلسلہ میں کوئی بار نہ ڈالا جائے، کیونکہ یہ سارے مسلمانوں سے تعلق رکھنے والے کام ہیں اور ان کے مصالح کا تحفظ تمام تر امام کی ذمہ داری ہے[1]

ان نظائر سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ابتدائی دور کی اسلامی ریاست زراعت کی ترقی کے لیے ہر طرح کا اہتمام کرتی تھی۔ اس بات کی کوشش کی جاتی تھی کہ قابلِ کاشت زمینیں بے کار نہ پڑی رہیں۔ بنجر اور اُفتادہ زمینوں کو قابلِ کاشت بنایا جائے اور آبپاشی کے لیے نہریں تعمیر کی جائیں۔ اس دور کی معیشت ایک زرعی معیشت تھی۔ دورِ جدید کی طرح صنعت کو فروغ نہیں حاصل ہوا تھا۔ زراعت کی ترقی کے اہتمام کے پہلو بہ پہلو اشیاء ضرورت کے نرخ ارزاں رکھنے کی بھی فکر کی جاتی تھی۔ ان باتوں سے اسلامی ریاست کے اس عام رجحان کا پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی رعایا کی معاشی فلاح و بہبود کا اہتمام کرتی ہے اور ملک کی معیشت کو ترقی دینا چاہتی ہے۔ دورِ جدید کے حالات میں اس رجحان کے پیشِ نظر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی ریاست کو ملک کے قدرتی وسائل سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے ترقی کی تمام ممکن تدبیریں اختیار کرنی چاہییں۔ افراد کو ترقیاتی کاموں کی ترغیب دینے اور اس سلسلہ میں اُن کی مالی امداد کرنے کے ساتھ ریاست کو اس کام میں براہِ راست بھی حصہ لینا چاہیے۔ معدنی وسائل

[1] ابو یوسف: کتاب الخراج ص ۱۳۱، ۱۳۲۔

کو ترقی دے کر کام میں لانا، دریاؤں کے پانی سے بجلی کی طاقت حاصل کرنا اور آب پاشی کے لیے بند تعمیر کرنا اور ملک کی زرعی اور صنعتی ترقی کے لیے دوسرے موزوں اقدامات کرنا دورِ جدید کی ایک اسلامی ریاست کے پروگرام میں اسی طرح شامل ہونا چاہیے جس طرح ابتدائی اسلامی ریاستوں کے پروگرام میں زرعی ترقی کا اہتمام شامل تھا۔

۳۔ تقسیمِ دولت کے اندر پائے جانے والے تفاوت کو کم کرنا: قرآن و سنت اور خلافتِ راشدہؓ کے نظائر سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلامی ریاست کی معاشی پالیسی کا ایک رہنما اصول یہ بھی ہے کہ معاشرہ میں تقسیمِ دولت کے اندر جو تفاوت پایا جاتا ہے وہ کم ہو اور سماجی دولت کسی ایک طبقہ کے اندر مرکوز ہو کر نہ رہ جائے۔ مکی دور میں ہی مسلمانوں پر یہ بات واضح کر دی گئی تھی کہ دولت مند افراد کے مال میں دولت سے محروم افراد اور ضرورت سے مجبور ہو کر دستِ سوال دراز کرنے والوں کا بھی حصّہ ہے۔

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔ (ذاریات: ۱۹)

اور ان کے اموال میں سائل اور محروم افراد کا بھی حق ہے۔

پھر مدنی دور میں جب بنو نضیر نامی یہودی قبیلہ کو ان کی بدعہدی اور اسلام دشمنی کی وجہ سے جلاوطن کیا گیا اور ان سے حاصل ہونے والے اموال کی تقسیم کا مسئلہ سامنے آیا تو یہ حکم نازل کیا گیا کہ یہ اموال ضرورت مند لوگوں کے لیے ہیں۔ اس حکم کی مصلحت یہ بتائی گئی کہ مال کو سماج کے دولت مند افراد کے درمیان مرکوز نہیں ہونا چاہیے۔

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ۔ (الحشر: ۷)

ان آبادیوں کو جن کے اموال کو اللہ نے اپنے رسول کو عطا کیا ہے وہ اللہ، اس کے رسول اور رسول کے قرابت داروں نیز یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کے لیے مخصوص ہیں تاکہ ایسا نہ ہو کہ مال و دولت تمہارے صاحبِ ثروت لوگوں ہی کے درمیان چکر کھاتی رہ جائے۔

اس آیت سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ مال و دولت کو اغنیاء کے درمیان گردش کرتے

رہ جانے سے روکنا اسلامی ریاست کی معاشی پالیسی کا ایک مقصد ہے، اسی آیت سے یہ بات بھی واضح ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لیے قانونِ زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے مناسب اقدام بھی کیے جاسکتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں تقسیمِ دولت کے اندر پائے جانے والے تفاوت کو کم کرنے کا مقصد اسلامی ریاست نے تین طریقوں سے حاصل کیا۔ ہر سال زکوٰۃ اور عُشر کے ذریعہ دولت مندوں کے مال کا ایک حصہ غریبوں کی طرف منتقل کیا جاتا رہا۔ فئے کے مال کو غریبوں کے درمیان تقسیم کیا گیا اور اصحابِ دولت کو ترغیب و تلقین کے ذریعہ اس بات پر اُبھارا گیا کہ وہ اہلِ حاجت کی مالی امداد کریں۔

جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے اور فئے کا مال آیا تو آپ نے اسے عوام کے درمیان مساوی طور پر تقسیم کر دیا اور چھوٹے بڑے، آزاد، غلام، مرد اور عورت سب کو برابر کا حصہ دیا۔ جب بعض لوگوں نے آپ سے یہ کہا کہ خدمتِ اسلام اور اسلام لانے میں سبقت کی بنا پر ہمیں بعض سے زیادہ حصہ دینا چاہیے تو آپ نے اس کا جواب یہ دیا کہ:

اما ما ذکرتم من السوابق والقدوم والفضل فما اعرفنی بذلك وانما ذلك شئ ثوابه علی اللہ جلّ ثناءہ۔ وھذا معاش فالاسوۃ فیہ خیر من الاثرۃ[1]

"تم نے جو سابقیت، اولیت، اور فضیلت کا ذکر کیا ہے تو میں اس سے بہت اچھی طرح واقف ہوں لیکن یہ ایسی چیزیں ہیں جن کا ثواب اللہ جل ثناءہ کے ذمہ ہے مگر یہ معاملہ معاش کا ہے۔ اس میں مساوات کا برتاؤ ترجیحی سلوک سے بہتر ہے۔"

ایک دوسری روایت:۔

"ان ابا بکر کلّم فی ان یفضل بین الناس فی القسم۔ فقال: فضائلھم عند اللہ، فامّا ھذا المعاش فالتسویۃ فیہ خیر"[2]

ابوبکرؓ سے کہا گیا کہ وہ فئے کی تقسیم میں بعض لوگوں کو بعض پر ترجیح دیں تو آپ نے فرمایا: "ان کے فضائل کا اعتبار اللہ کے یہاں ہوگا۔ جہاں تک اس معاشی زندگی کا سوال ہے اس میں برابر کا سلوک کرنا بہتر ہے۔"

---

[1] ابو یوسف: کتاب الخراج ص ۵۰ [2] ابو عبید: کتاب الاموال ص ۲۶۳

خلیفۂ اول کا یہ ارشاد اگرچہ فے کی تقسیم سے متعلق ہے لیکن آخری جملہ میں آپ نے ایک اصولی حقیقت کا اظہار فرمایا ہے جس سے اسلامی ریاست کی معاشی پالیسی کا عام رجحان اخذ کیا جا سکتا ہے۔ یہ عام رجحان یہ ہے کہ وسائلِ معاش کی تقسیم میں تفاوت کے بجائے مساوات کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

تقسیمِ دولت کے اندر پائے جانے والے تفاوت کو کم کرنے کے باقی دو طریقے، جو عہدِ نبوی میں اختیار کیے گئے تھے، عہدِ صدیقی میں بھی نافذ رہے۔ جب بعض قبائل نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کیا تو ریاست نے ان کے خلاف فوجی کارروائی کر کے ان کو اس حق کی ادائیگی پر مجبور کیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اس اصول کے مطابق عمل کی اہم ترین مثال وہ پالیسی ہے جو عراق و شام کی مفتوحہ زمینوں کو فوجیوں کے درمیان تقسیم نہ کرنے کے فیصلہ کا باعث بنی۔ پہلے حضرت عمرؓ بعض صحابہ کے اس مشورہ کی طرف مائل ہو گئے تھے کہ یہ زمینیں فوجیوں کے درمیان تقسیم کر دی جائیں۔ لیکن بعد میں جب آپ کی توجہ اس طریقے کے بُرے نتائج کی طرف مبذول کرائی گئی تو آپ نے مزید غور کیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو آیاتِ فے (سورۂ حشر آیات ۶ تا ۱۰) کا ایسا فہم عطا کیا کہ آپ نے اس تجویز کو مسترد کر دیا اور ان زمینوں کو سارے مسلمانوں کی ملکیت قرار دینے کا فیصلہ کیا۔

فقدم عمر الجابية فاراد قسم الارض بين المسلمين۔ فقال معاذ والله اذن ليكونن ما تكره۔ انك ان قسمتها صار الريع العظيم في ايدي القوم، ثم يبيدون فيصير ذالك الى الرجل الواحد او المرأة، ثم يأتي من بعدهم قوم يسدون من الاسلام مسدًّا، وهم لا يجدون شيئًا فانظر امرًا يسع	عمر جابیہ آئے تو انھوں نے زمین کو مسلمانوں کے درمیان تقسیم کرنے کا ارادہ کیا۔ معاذ نے آپ سے کہا خدا کی قسم پھر تو وہی ہوگا جو آپ کو ناپسند ہے اگر آپ نے زمین کو تقسیم کیا تو بڑے بڑے علاقے ان (موجودہ) لوگوں کے ہاتھ چلے جائیں گے پھر یہ مر جائیں گے تو یہ زمینیں (وراثت کے ذریعہ) کسی ایک آدمی یا عورت کے ہاتھ میں آجائیں گی پھر ان کے بعد دوسرے لوگ (اسلام میں داخل ہو کر) آئیں گے جو اسلام کا دفاع کریں گے مگر ان کو کچھ نہ مل سکے گا۔ آپ غور و فکر کے بعد کوئی ایسا طریقہ اختیار کیجیے جو آج کے مسلمانوں کے لیے بھی مفید ہو اور

اولھم و اٰخرھم | بعد میں آنے والوں کے لیے بھی مفید ہو۔

قال ھشام : وحدثنی الولید بن مسلم عن تمیم بن عطیۃ عن عبد اللہ بن ابی قیس۔ او ابن قیس :۔ انہ سمع عمر یکلم الناس فی قسم الارض ۔ ثم ذکر کلام معاذ ایاہ ۔ قال فصار عمر الی قول معاذ[1]

(حدیث کے راوی) ہشام نے کہا: مجھ سے ولید بن مسلم نے بروایت تمیم بن عطیہ بروایت عبد اللہ بن ابی قیس یا ابن قیس ۔۔ حدیث بیان کی ہے کہ انھوں نے عمر کو زمین کی تقسیم کے بارے میں لوگوں سے (مشورۃً) گفتگو کرتے سنا پھر راوی نے اس بات کا ذکر کیا جو معاذ نے عمر سے کہی ۔ راوی کہتا ہے کہ پھر عمر نے معاذ کی بات مان لی ۔

حضرت معاذؓ بن جبل نے زمینوں کی تقسیم کے خلاف رائے دیتے وقت جو بات فرمائی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود حضرت عمر کو سماج میں دولت کا تمرکز ناپسند تھا۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ زمین کی ملکیت ایک محدود طبقہ میں گھر کر رہ جائے اور باقی افراد اس سے محروم رہیں۔ حضرت معاذ کی رائے یہ تھی کہ زمین کے بڑے بڑے رقبوں کا چند افراد کے ہاتھوں میں آجانا برا ہے۔ اس سے آئندہ آنے والوں کی حق تلفی اور ہمت شکنی ہوتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ان دلائل کو وزن دینا اور ان کی روشنی میں ایک اہم فیصلہ کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کے نزدیک سماج کو دولت کے تمرکز سے بچانا اسلام کی معاشی پالیسی کا ایک رہنما اصول ہے۔

فے کے مال کی تقسیم کے بارے میں ابتداءً حضرت عمرؓ نے بھی مساوی تقسیم کی اسی پالیسی پر عمل کیا جو حضرت ابوبکر نے اختیار کی تھی[2] لیکن ۱۶ھ میں جب عراق و شام کی فتح سے مال خمس اور فے کے طور پر حاصل ہوا تو آپ نے اپنی پالیسی تبدیل کر دی۔ آپ نے اسلام لانے میں سبقت کرنے والوں کو اور اسلام کی نمایاں خدمات انجام دینے والوں کو عام افراد سے زیادہ حصے دیئے، جن افراد نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ

[1] ابو عبید۔ کتاب الاموال ص ۵۹ ۔ نیز ملاحظہ ہو بلاذری : فتوح البلدان ص ۱۵۱

[2] ابو یوسف : کتاب الخراج ص ۲۹

مکہ میں طرح طرح کے مصیبتیں جھیلی تھیں، اسلام کے لیے اپنا گھر بار چھوڑ کر ہجرت کی تھی اور مدینہ کے ابتدائی دور میں آپ کے ساتھ مل کر کفار سے جنگیں کی تھیں اُن کو آپ نے بعد میں ایمان لانے والوں سے زیادہ حصّوں کا مستحق قرار دیا۔ تقسیم فے میں مساوی سلوک کی جگہ ترجیحی سلوک کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ آپ کو یہ کسی طرح گوارا نہ تھا کہ جن لوگوں نے اسلام میں داخل ہونے سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگیں لڑی تھیں ان کو ان لوگوں کے برابر کے حصّے دیے جائیں جنہوں نے ابتدا ہی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شانہ بشانہ کفار سے جنگ کی تھی۔

قال: لا اجعل من قاتل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کمن قاتل معہ[1]	آپ نے فرمایا: جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ کی تھی ان کو میں (تقسیم فے میں) اُن کے برابر نہیں کر سکتا جنہوں نے آپ کے ساتھ ہو کر جنگ کی تھی۔

اس نئے طریق کار کے حق میں جو سیاسی، معاشرتی، نفسیاتی اور دینی دلائل دیے جا سکتے ہیں وہ واضح ہیں۔ لیکن معاشی طور پر اس کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ سماج کے اندر تقسیم دولت میں مزید ناہمواری پیدا ہو۔ چنانچہ آٹھ سال[2] تک اس پالیسی پر عمل کرنے کے بعد اپنے دورِ خلافت کے آخری سال میں حضرت عمرؓ نے اپنی رائے پھر تبدیل کی اور آئندہ تقسیم فے میں مساوات برتنے کا ارادہ ظاہر کیا۔

حدثنا عبد الرحمٰن بن مهدی عن هشام بن سعد عن زيد بن اسلم عن ابيه قال: سمعت عمر يقول: لئن عشت الى هذا العام المقبل لألحقن اخر الناس باولهم حتى يكونوا بيانا واحدا:	ہم سے عبد الرحمٰن بن مہدی نے انہوں نے ہشام بن سعد سے انہوں نے زید بن اسلم سے اور انہوں نے اپنے والد سے روایت کرتے ہوئے حدیث بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے عمر کو یہ کہتے سنا ہے کہ "اگر میں آئندہ سال اس دن تک زندہ رہا تو (تقسیم فے میں) آخر کے لوگوں کو سر فہرست لوگوں سے ملا دوں گا تاکہ سب مساوی ہو جائیں۔

[1] ابو یوسف: کتاب الخراج ص ۵۰

[2] ۱۶ھ تا ۲۳ھ

[قال عبد الرحمٰن: ببّانا واحدًا شيئًا واحدًا] [1]

[عبد الرحمٰن نے کہا: ببّاناً واحداً کے معنی یہ ہیں کہ ایک ہی جیسے ہو جائیں]

اسی روایت کو ابنِ سعد نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے:۔

"سمعت عمر بن الخطاب يقول: والله لئن بقيت الى هذا العام المقبل لالحقن اخر الناس باولهم ولاجعلنهم رجلاً واحداً [2]

میں نے عمر بن الخطاب کو یہ کہتے سنا ہے کہ "خدا کی قسم اگر میں آئندہ سال اس موقعہ تک زندہ رہا تو آخر لوگوں کو شروع کے لوگوں سے ملا دوں گا اور ان سب کو ایک جیسا کر دوں گا۔

... عن زيد بن اسلم عن ابيه انه سمع عمر بن الخطاب قال: لئن بقيت الى الحول لالحقن اسفل الناس باعلاهم [3]

زید بن اسلم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے عمر بن الخطاب کو یہ کہتے سنا ہے کہ: اگر میں ایک سال اور زندہ رہا تو وظیفہ میں حصے کے اعتبار سے سب سے نیچے کے لوگوں کو سب سے اوپر کے لوگوں کے مساوی کر دوں گا۔

ولما رای المال قد كثر قال: "لئن عشت الى هذه الليلة من قابل لالحقن اخر الناس باولاهم حتى يكونوا فى العطاء سواء۔ قال فتوفى رحمه الله قبل ذالك [4]

(راوی کہتا ہے کہ) جب آپ نے دیکھا کہ رقم کا مال بہت زیادہ آنے لگا ہے تو فرمایا "اگر میں آئندہ سال اس شب زندہ رہا تو (رجسٹر میں درج) آخر کے لوگوں کو شروع کے لوگوں سے ملا دوں گا تاکہ سارے لوگوں کو برابر برابر وظیفے ملنے لگیں۔ (راوی نے کہا کہ) آپ اس سے پہلے ہی انتقال فرما گئے اللہ آپ پر رحم فرمائے۔

[1] ابو عبید: کتاب الاموال ص ۲۶۳-۴۔

[2] محمد ابن سعد: الطبقات الکبریٰ طبع بیروت جلد ۳ ص ۳۰۱۔

[3] ایضاً ایضاً

[4] ابو یوسف کتاب الخراج ص ۵۵

ان روایات سے یہ بات تو قطعی طور پر ثابت ہے کہ حضرت عمرؓ نے تقسیم فَے میں عدمِ مساوات برتنے کی پالیسی سے رجوع کر کے مساوات برتنے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن یہ واضح نہ ہو سکا کہ آپ نے یہ فیصلہ کس وجہ سے کیا تھا۔ کتاب الخراج کی مذکورہ بالا روایت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مالِ فَے کی کثرت اس نئے فیصلہ کا سبب بنی تھی لیکن ہمیں یہ توجیہ کافی نظر نہیں آتی۔ سابقین اولین اور اسلام کی نمایاں خدمات انجام دینے والوں کا امتیاز برقرار رکھنے کا جو مقصد حضرت عمرؓ کے سامنے تھا وہ اسی وقت پورا ہو سکتا تھا جب مالِ فَے کی کثرت کے باوجود، ان افراد کے حصے دوسرے افراد سے زیادہ رکھے جاتے۔ صرف مالِ فَے کی کثرت اس بات کے لیے کافی نہیں کہ ان کے امتیازی مقام کو نظر انداز کر دیا جائے، یہ بھی ممکن تھا کہ سب کے حصوں میں اضافہ کر دیا جاتا اور منتخب لوگ پھر بھی دوسروں سے زیادہ حصہ پاتے، نئے فیصلہ کے لیے ضروری ہے کہ حضرت عمرؓ کے سامنے کوئی ایسی مصلحت ہو جس کو وہ ان مصالح پر ترجیح دینے لگے ہوں جو امتیازی سلوک اور غیر مساوی تقسیم کے فیصلے کے وقت ان کے سامنے تھے اور گیارہ سال تک برابر سامنے رہے۔

ہمارے نزدیک یہ نئی مصلحت ان مفاسد کے ازالہ کی ضرورت تھی جو سماج کے اندر تقسیمِ دولت میں بڑھتے ہوئے تفاوت سے پیدا ہو رہے تھے، یا آئندہ پیدا ہو سکتے تھے۔ جن لوگوں کو دوسروں سے زیادہ حصے مل رہے تھے ان کے اندر معیارِ زندگی کو حدِ اعتدال سے زیادہ بلند کرنے، جائدادیں خریدنے اور جہاد فی سبیل اللہ کی طرف سے قدرے غافل ہو جانے کے رجحانات پیدا ہوتے دیکھ کر آپ کی بصیرت نے یہ بھانپ لیا ہوگا کہ ان رجحانات کو غیر مساوی تقسیمِ فَے سے مزید تقویت حاصل ہوگی دوسری طرف یہ بھی ممکن ہے کہ گیارہ سال تک امتیازی سلوک کرنے کے بعد اب آپ کے نزدیک اس طریقہ کو باقی رکھنا اتنا ضروری نہ رہ گیا ہو۔ کیونکہ جن افراد کو آپ ممتاز کرنا چاہتے تھے ان کو اس طویل عرصہ میں خاصہ موقعہ مل چکا تھا۔

نئے فیصلہ کے مطابق جن لوگوں کو پہلے زیادہ حصہ مل رہا تھا ان کے حصہ میں کمی نہیں ہوتی بلکہ جو لوگ پہلے کم حصہ پاتے تھے اُن کے حصہ میں اتنا اضافہ پیشِ نظر تھا کہ سب کے حصے برابر ہو جائیں ایسا

کرتا اسی وجہ سے ممکن ہو سکا تھا کہ فَے کا مال اب پہلے سے زیادہ تھا۔ کتاب الخراج کی مذکورہ بالا توجیہ ہمارے نزدیک فیصلہ کے صرف اسی پہلو پر منطبق ہوتی ہے۔

لیکن ایک دوسری روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کا ارادہ تھا کہ امیر لوگوں کی فاضل دولت لیکر غریبوں کے درمیان تقسیم کر دیں۔

عن ابی وائل قال قال عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ لو استقبلت من امری ما استدبرت لاخذت فضول اموال الاغنیاء فقسمتها علی فقراء المهاجرین [1]	ابو وائل سے مروی ہے کہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: جو امور میں پہلے طے کر چکا اگر انہیں مجھے آئندہ بھی طے کرنے کا موقع ملتا تو میں امیروں سے ان کی فاضل دولت لے کر اُسے فقرائے مہاجرین کے درمیان تقسیم کر دیتا۔

اپنے دورِ خلافت کے آخری برس میں حضرت عمر کا یہ ارشاد واضح طور پر یہ بتاتا ہے کہ آپ سماج میں دولت کی تقسیم میں بڑھتی ہوئی ناہمواری سے پریشان رہنے لگے تھے، اور اس صورتِ حال کی روشنی میں اپنے بعض گزشتہ فیصلوں پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس کرتے تھے اور ایک راست اقدام کے ذریعہ تقسیمِ دولت کے اندر پائے جانے والے تفاوت کو کم کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ یہ روایت ہماری اس رائے کی بھی تائید کرتی ہے کہ تقسیمِ فَے کے بارے میں حضرت عمرؓ کے نئے فیصلے کی اصل وجہ گزشتہ پالیسی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی ناہمواری اور بڑھتی ہوئی عدمِ مساوات تھی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اموالِ فَے کی تقسیم میں مساوات کی پالیسی پر عمل نہیں کیا۔ مزید برآں آپ نے عراق و شام کی زمینوں کو، جن کا مالیہ اب تک بیت المال براہِ راست کاشتکاروں سے وصول کرتی تھی، متعینہ خراج پر درمیانی افراد کو دینے کا طریقہ اختیار کیا۔ یہ افراد کاشت کاروں اور بیت

[1] طبری: تاریخ ص ۲۷۴ (حوادث ۲۳ھ) اور ابن حزم المحلی جلد ۶ ص ۱۵۸۔ ابن حزم نے لکھا ہے کہ اس روایت کی سند بہت صحیح اور پختہ ہے۔

کے درمیان آگئے، ریاست کو متعینہ رقم ادا کرتے اور کاشت کاروں سے مختلف شرحوں کے مطابق لگان وصول کرتے یا پیداوار میں شریک ہو جاتے اور اس طرح خود نفع کماتے۔ اسی چیز نے آگے چل کر زمینداری اور جاگیرداری کی شکل اختیار کر لی جس سے گوناگوں مفاسد رونما ہوئے۔ ابتداءً یہ طریقہ اس لیے اختیار کیا گیا تھا کہ ریاست کو مالیہ وصول کرنے میں سہولت ہو اور وہ ان انتظامی زحمتوں سے بچ سکے جو لاکھوں چھوٹے چھوٹے کاشت کاروں سے مالیہ وصول کرنے میں اسے اٹھانی پڑتی تھی اس طریقہ کو اختیار کرنے سے ریاست کی آمدنی بھی بڑھ گئی تھی لیکن یہ درمیانی افراد کاشت کاروں پہ زیادہ بار ڈالنے لگے اور اپنا نفع بڑھانے لگے۔

مقررہ سالانہ وظائف کے علاوہ حضرت عثمانؓ نے متعدد افراد کو ان کی خدمات کی بناء پر فراخ دلی کے ساتھ مزید رقمیں بھی عطا کیں۔ پھر مروان بن حکم کے بعض تصرفات کے نتیجہ میں ایک خاص طبقہ — بنو امیہ — کو بیش از بیش مالی فوائد حاصل ہونے لگے۔

ان پالیسیوں کے نتیجہ میں اسلامی معاشرہ کے اندر تقسیم دولت میں پایا جانے والا تفاوت بہت بڑھ گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس پالیسی پر اعتراض تھا۔ آپ فے کی تقسیم کے بارے میں وہی رائے رکھتے تھے جو حضرت ابوبکرؓ کی تھی[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت اضطراب کے عالم میں گزرا اور اس کے بعد سلاطینِ بنو امیہ نے نہ صرف یہ کہ معاشرہ میں دولت اور آمدنی کی تقسیم میں بڑھتی ہوئی ناہمواری کو کم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ ان کی پالیسی کے نتیجہ میں یہ تفاوت بڑھتا گیا۔ جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ ہوئے اور آپ نے زندگی کے مختلف شعبوں کو حقیقی اسلام کے مطابق از سرِ نو منظم کرنے کی کوشش کی تو معاشی نظام میں بھی متعدد اصلاحات عمل میں لائی گئیں۔ بے جا طریقہ پر دی ہوئی جاگیریں واپس لے کر ان کے اصلی مالکوں کو دی گئیں۔ جن سرکاری زمینوں کو لوگوں نے ذاتی ملکیت بنا لیا تھا ان کی سابق حیثیت بحال کی گئی اور آئندہ کے لیے ایسی زمینوں کی خرید و فروخت ممنوع قرار دے دی گئی۔ بعد میں

[1] ابو عبید: کتاب الاموال ص ۳۶۴

آنے والے حکمرانوں نے ان اصلاحات کو ترک کر دیا اور حکومت کی معاشی پالیسی میں دوبارہ اسلام کے اصولوں سے انحراف کی مختلف شکلیں نمودار ہونے لگیں۔

ہمیں اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن و سنت کی تعلیمات کا صحیح مفہوم وہ ہے جو خلافتِ راشدہ کے عمل سے ہمارے سامنے آتا ہے۔ اسلام کسی فرد پر دولت کے کسب کے سلسلہ میں کوئی اصولی اور دائمی پابندی نہیں عائد کرتا لیکن اسے یہ بات پسند نہیں کہ دولت سماج کے ایک طبقہ میں مرکوز ہو کر رہ جائے۔ قرآن، سنتِ نبوی اور خلافتِ راشدہ کے نظائر کی روشنی میں ہم اطمینان کے ساتھ یہ رائے قائم کر سکتے ہیں کہ دولت اور آمدنی کی تقسیم کے اندر تفاوت کو کم کرنا اسلام کی معاشی پالیسی کا ایک رہنما اصول ہے۔

اس رائے کی مزید تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اسلام کو معاشرہ میں عیش پرستوں اور مترفین کے طبقہ کا ظہور سخت ناپسند ہے۔ ہم اس کتاب کے پہلے باب میں یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ قرآن کریم کے فلسفۂ تاریخ کی روشنی میں کسی معاشرہ میں عیش کوشی اور عیش پرستی کرنے والے طبقہ کا ظہور اور غلبہ اس معاشرہ کی ہلاکت اور بربادی کا پیش خیمہ ہے۔ تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ تقسیم دولت میں بڑھتا ہوا تفاوت اس طبقہ کے ظہور کے لیے راہیں ہموار کرتا ہے۔ اس بنا پر بھی یہ ضروری ہے کہ اسلامی ریاست اس بات کا اہتمام کرے کہ دولت اور آمدنی کی تقسیم میں روز افزوں تفاوت کا رجحان نہ جڑ پکڑ سکے۔

تفہیم القرآن - مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیر قرآن پاک۔ قدیم و جدید معلومات کا خزینہ نہایت اہم اور قیمتی نقشوں اور ارض القرآن کی نایاب تصاویر۔

جلد اوّل - سورۂ فاتحہ تا الانعام۔ قسم اوّل ۲۵-۲۱ روپے۔ قسم عام ۲۵-۱۶ روپے

جلد دوم - الاعراف تا بنی اسرائیل " ۲۵-۲۲ " " ۲۵-۱۸ "

جلد سوم کہف تا الروم ۵۰-۲۷

مکتبہ تعمیر انسانیت۔ گوجر گل موچید دروازہ۔ لاہور